ڈاکٹر راحت افشاں

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

فردوس حیدر باشعور افسانہ نگار

ABSTRACT

Firdous Hyder: a conscientious short story writer
By Dr. Rahat Afshan, Asst. Prof., Department of Urdu, University of Karachi.

Firdous Hyder was one of the prominent Urdu short story writer of our time. She has penned a large number of Urdu short stories. This paper first describes her brief biographical sketch and a family background that shaped her mind and gave her a peculiar bent of mind, which was later on reflected in her writings. The author of this paper has taken into account Firdous Hyder's short stories while analyzing them and has concluded that Firdous Hyder was ever so careful as to take into account different ingredients of the miliey against the backdrop of which she wrote. It shows how Firdous Hyder reflects her conscientiousness in her Urdu short stories with examples from her works.

فردوس حیدر ہمارے ملک کی نامور افسانہ نگاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ آپ کو ادبی ذوق اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ فردوس حیدر کے والد خواجہ محمد منظور پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے۔ وہ ادبی ذوق رکھتے تھے اور اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا تخلص ''ہاتفی'' تھا۔ نظریاتی طور پر کارل مارکس کے حامی تھے اور فیض احمد فیضؔ کے مداحوں میں سے تھے۔

فردوس حیدر کا اصلی نام فردوس بریں ہے اور وہ ۵ نومبر ۱۹۴۰ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئیں۔ فردوس حیدر بھی ابتدا ہی سے اپنے والد کی طرح انقلاب پسند تھیں چنانچہ میٹرک کا امتحان پاس کرتے ہی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے کالج میں داخلہ لینے کا اعلان کردیا جس پر والدہ نے سختی سے انکار کردیا۔ فردوس حیدر نے احتجاجاً بھوک ہڑتال کردی۔ اس پر والد نے وعدہ کیا کہ مالی حالات اچھے ہوتے ہی کالج میں داخلہ کرادیں گے لیکن اس سے پہلے منشی فاضل کرکے دکھاؤ۔ والد کی حوصلہ افزائی سے انھوں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور اپنی مدد آپ کے تحت امتحان کی تیاری کی۔ انھوں نے میٹرک لاہور سے اور منشی فاضل گوجرانوالہ سے کیا۔ ''لاہور کالج فار ومن'' لاہور سے بی۔ اے کیا اور پشاور یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ کالج کے زمانے میں مباحثوں میں حصہ لیتی رہیں۔

فردوس حیدر نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ۱۹۶۵ء میں کالج کے زمانے ہی سے کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنا پہلا باقاعدہ افسانہ ''اجنبی'' کے عنوان سے ۱۹۶۵ء میں لکھا۔ جو ''گرہستی'' پشاور میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ تا عمر جاری رہا۔ (۱۷، جنوری ۲۰۱۷ء، کو اختتام پذیر ہوا۔)اور بہت سے معیاری ادبی رسائل یعنی ''تخلیق'' لاہور، ''ادب لطیف'' لاہور، ''تجدید نو'' لاہور، ''معیار'' کراچی، ''صریر'' کراچی، ''افکار'' کراچی، ''سیپ'' کراچی اور ''ماہ نو'' لاہور وغیرہ میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے۔

فردوس حیدر کے افسانوں کے مجموعے ''راستے میں شام'' (۱۹۸۲ء)، ''بارشوں کی آرزو'' (۱۹۸۸ء)، ''پتھر میری تلاش میں'' (۱۹۹۲ء)، ''خالی ہوا یہ دل'' (۲۰۰۳ء) شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ انھوں نے ناولٹ بھی لکھے اور کتابوں پر ان کے تنقیدی مضامین بھی چھپتے رہتے ہیں۔ فردوس حیدر نے بہت سے سفر بھی کیے ہیں۔ امریکہ، لیبیا، سنگاپور، جاپان، ایران اور افغانستان جا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سال استنبول (ترکی) میں گزارا کیوں کہ انھیں ترکی زبان سیکھنے کے لیے وظیفہ ملا تھا اور چار سال تک بنکاک کے ایک ہوٹل میں انگریزی پڑھاتی رہیں۔

فردوس حیدر ترقی پسند خیالات رکھنے والی افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں عہد حاضر کی تلخیوں کو پیش کرتی ہیں۔ وہ معاشرے کی بے شمار برائیوں اور خامیوں کو دیکھتی ہیں اور ان کی نظر عورت کے کرب پر جا کر ٹھہر جاتی ہے۔ انھوں نے سماجی اور سیاسی حالات کے سبب جو مسائل درپیش آتے ہیں اسے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور اس پس منظر میں عورت کی کم مائیگی اور بے چارگی پر قلم اٹھایا ہے۔ ترقی یافتہ اور مہذب معاشرے میں آج بھی عورت اسی استحصال کا شکار ہے۔ سماجی و سیاسی حالات کی تبدیلی، عقائد و نظریات میں تبدیلی کے باوجود عورت کی حیثیت آج بھی پہلے جیسی ہے۔ ان حقائق کا اظہار انھوں نے بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنی تحریروں میں کیا ہے لیکن ساتھ ہی توازن کا بھی خیال رکھا ہے۔ وہ معاشرے کے خلاف بغاوت اور احتجاج کرتی ہیں۔ مگر نعرہ بازی یا بہت زیادہ فلسفیانہ بیانوں سے کام نہیں لیتیں۔ ''بارشوں کی آرزو'' (۱۹۸۸ء) کے فلیپ پر ڈاکٹر رشید امجد فردوس حیدر کی افسانہ نگاری پر رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> فردوس حیدر ایک باشعور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیاں دکھ سکھ کی وہ آرٹ گیلری ہیں جہاں پورا عہد اپنے سیاسی، سماجی عمل کے ساتھ منعکس ہوتا ہے۔ ان کے کردار، واقعات اور ماحول ہزیمت اٹھائے لوگوں کی کہانی سناتے ہیں۔ ایک ایسی کہانی جو تیسری دنیا کے سبھی ملکوں میں دہرائی جا رہی ہے۔ فردوس حیدر کی کہانیوں کی تہہ میں اتر کر دیکھا جائے تو سسٹم اور طبقہ واریت کے خلاف ایک شدید احتجاج سنائی دیتا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے سیاسی جبر اور سماجی ناانصافی کو براہ

راست اپنا موضوع نہیں بنایا لیکن اپنی کہانیوں کو اس طرح ترتیب دیا ہے اور خام مواد یوں جمع کیا ہے کہ اندرونی سطح پر یہ ساری کیفیت اپنے تمام سیاق و سباق کے ساتھ موجود رہتی ہے۔ ان کے اکثر کردار خواہشوں کے مارے ہوئے مجبور لوگ ہیں لیکن اپنی بے بسی کے باوجود زندہ رہنے کی امنگ رکھتے ہیں۔

فردوس حیدر اپنے افسانوں میں صرف عورتوں کے مسائل پر ہی قلم نہیں اٹھاتیں بلکہ ان کے افسانوں میں عورت کی بے چارگی، بے بسی اور اس کے جنسی استحصال کے علاوہ سیاسی اور سماجی حالات کے پیدا کردہ مسائل بھی موضوع بنے ہیں ہاں یہ بات ضرور ہے کہ موضوعات میں تنوع کے باوجود فردوس حیدر کی فکری سطح بیشتر صورتوں میں عورت کے غم سے جڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے انھیں اس بات کا دکھ ہے کہ ملک آزاد ہوگیا، ہم آزاد ہوگئے مگر آج بھی ہمارے معاشرے میں عورت کی زندگی کے حوالے سے کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی اور حالات اور واقعات جیسے تھے آج بھی ویسے ہی ہیں۔

فردوس حیدر کے افسانوں کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں پر ظلم و زیادتی پر ایک خاص انداز سے احتجاج کیا ہے جو کسی طرح بھی نعرہ بازی محسوس نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کوئی خاص فلسفہ نظر آتا ہے بلکہ بیشتر صورتوں میں عورتوں کی توہین اور تحقیر کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> سڑک کے اس حصے میں جہاں سامنے کھلا میدان ہے لکڑی کی چار پہیوں والی گاڑی پر بیٹھی ہوئی ہوں۔ میں اسے گاڑی کہتی ہوں کہ یہ میری واحد سواری ہے میں اپنی دونوں ہتھیلیاں باری باری زمین پر ٹکائے اسے آگے پیچھے دھکیل کر جہاں چاہے جاسکتی ہوں۔ میں آزاد رہنا چاہتی ہوں لیکن مجھ پر ملکیت جتانے والے ہر موڑ پر پیدا ہوجاتے ہیں۔ میری دیکھ بھال کے بہانے دراصل وہ اپنی دیکھ بھال کرتے ہیں۔(۱)

> گلاس گرجائے تو کرچیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن دل ٹوٹ جائے تو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ رحمت صاحب کی سب سے بڑی خوشی عورت تھی۔ اپنی پسند کی عورت وہ کسی بھی قیمت پر حاصل کرتے اور ایک مرتبہ شب بستری کے بعد چھوڑ دیتے۔ میں سال کے اسی دن اسی ماہ بلا معاوضہ ان کی زندگی میں آئی تھی میرے ساتھ ان کے والدین کی خواہش پر شادی کا ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔۔۔ اور بس۔۔۔'' وہ آنسو پونچھنے لگی۔(۲)

> تم دونوں بھاگ کر جس علاقے میں آئے پاکستان کہلایا۔ بارڈر لائن کے پار کوئی تم

سے انتقام لینے نہ آیا۔ تمھارے گھر والوں کو پتہ نہ چلا کہ تم بلوائیوں کے ہاتھوں مر چکی ہو یا سرحد پار زندگی گزار رہی ہے۔ شیام نے شیردل کا روپ دھار لیا اور مزدوری کرنے لگا اور تم بھجن کی جگہ نعت خوانی میں سرور حاصل کرنے لگیں۔ بھگوان کے کئی نام ہیں۔ جس سے بھی پکارو سنتا ہے، تم نے شیام کو سمجھا دیا تھا لیکن خود ڈگمگا گئیں، اگر بڑی بیگم نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میری شادی قرآن سے ہوگی تو کیا ہوا۔ یہ فیصلہ ہمارا تو نہ تھا، مجھ سے بات کرتیں۔ (۳)

فردوس حیدر کے افسانوں میں عورت کی جنسی کشمکش یا بعض صورتوں میں جنسی استحصال بلند آہنگی کا شکار نہیں ہوتی۔ وہ بڑے فنکارانہ انداز میں اشارات کے ذریعے اس صورت حال کا اظہار کرتی ہیں۔ جگہ جگہ ان کے افسانوں میں اشاریت افسانے کے تاثر میں اضافہ کرتی ہے۔ اشاراتی اور استعاراتی فقرے یا بیان بعض صورتوں میں قاری کے ذہن کو اچانک ایک جھٹکے کے ذریعے پوشیدہ معنی کی ایک الگ دنیا میں سیر کراتے ہیں۔ جہاں ''ماموں سلیم'' جیسے ڈریکولائی خصلت کریہہ چہرے بھی نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی اس کی ہوس کا شکار ہونے والی مظلوم عورت بھی جو پھوپھی اور باجی کی صورتوں میں ارد گرد سہمی کھڑی ہیں۔ فردوس حیدر کے افسانے ''نیلے آنسو'' سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

میں رک جاتا ہوں۔ آپس میں گتھم گتھا ہوتے ہوئے دو جن۔۔۔۔ یا پھر ایک جن اور ایک چڑیل۔۔۔۔ پچھلی پائی۔۔۔۔ یا اسی قسم کی کوئی چیز۔۔۔۔

''میں بڑا ہوگیا ہوں'' میں سوچتا ہوں اور کوٹھڑی میں جاتا ہے۔ ایک سایہ بالکل ماموں سلیم جیسا لگتا ہے۔ وہی تہمند جو وہ سوتے وقت باندھتے ہیں اور پاؤں میں ربڑ کی چپل۔ میں دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اب کچھ نظر آنے لگا ہے۔ سفید دانت کسی کی گردن کی طرف بڑھے ہیں شاید خون چوس رہے ہیں۔

میں کسی ٹانگ پر اپنے دانت گاڑ دیتا ہوں۔ اور پورے زور سے کاٹتا ہوں۔ ''کون ہے'' ماموں سلیم کی آواز آتی ہے۔

میں بھاگ کر پھوپھو کے پاس پہنچتا ہوں۔ ماموں سلیم میرے پیچھے آتے ہیں اور پھوپھو کو اپنی ٹانگ پر میرے دانتوں کے نشان دکھاتے ہیں۔ باجی بھی کہیں سے بھاگتی ہوئی آتی ہے اور روتی ہوئی پھوپھو کی گود میں گرجاتی ہے۔ باجی کی گردن پر نیلا سا نشان ہے جسے میں اور پھوپھو ایک ساتھ دیکھ لیتے ہیں۔

''میں بھی ڈریکولا بن گیا ہوں'' میں ماموں سلیم کی ٹانگ کی طرف اشارہ کرکے رونے لگتا ہوں۔

پھوپھو مجھے گلے لگا کر دھاڑیں مار کے رونے لگتی ہیں۔ ان کا دوپٹہ سر سے اتر کر کندھے سے نیچے ڈھلک جاتا ہے۔ میں ان کی گردن پر باجی کی گردن جیسا نیلا نشان دیکھ لیتا ہوں اور رونا بھول جاتا ہوں۔'' (۴)

فردوس حیدر کے یہاں معاشرے کی متعدد برائیوں اور زندگی کے بے شمار مسئلوں کی جانب اشارہ تو ملتا ہے مگر مسلسل ایک متحرک نقطے کی شکل میں روشنی گھوم پھر کر عورت کے دکھ کی جانب قاری کی رہنمائی کرتی ہے جس سے قاری کی فکری سطح افسانہ نگار کی فکری سطح سے تال میل کا راستہ نکال لیتی ہے۔ فردوس حیدر کا افسانہ ''راستے میں شام'' سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> اس کا شوہر کھال ادھیڑنے کی دھمکی دے کر گھر سے نکلا ہے اور ہر روز اس کا شوہر اس کی کھال بیدوں ہی سے نہیں بلکہ اپنی تسکین کے لیے اپنی وحشیانہ گرفت سے بھی ادھیڑتا ہے۔ وہ اس کی کون سی بات اوروں سے چھپائے اور اوروں کی کون سی بات اپنے شوہر سے چھپائے۔ میرے شوہر کے تین بہترین نام ہیں۔ پتھر، ٹھنڈک اور قوت لیکن میرا صرف ایک نام ہے۔ ''چپ''۔(۵)

وہ عورت کو اس کا جائز مقام اور جائز حیثیت دینے کی خواہش مند ہیں۔ وہ اس بات کا بھی شعور رکھتی ہیں کہ ہمارا سماجی نظام اس استحصال کا ذمہ دار ہے۔ جو عورت کو اس کے مقام سے گرا دیتا ہے اس لحاظ سے ان کا نقطۂ نظر محدود نہیں وہ کہتی ہیں کہ:

> یہاں امیر آدمی ہی غریب کا استحصال نہیں کرتا بلکہ غریب بھی غریب کی حق تلفی کرتا ہے۔ عورت کو مرد یا مرد کو عورت ہی سے اذیت نہیں ملتی بلکہ عورت کے ہاتھوں عورت اور مرد کے ہاتھوں مرد بھی ظلم وستم کا نشانہ بنتے ہیں۔(۶)

فردوس حیدر معاشرے کی غلط روایتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ہیں، احتجاج کرتی ہیں لیکن اپنے آپ کو نعرہ بازی یا فلسفیانہ بیانات سے دور رکھتی ہیں۔ وہ عورتوں کی جذباتی ونفسیاتی کیفیات کو بڑے فنکارانہ انداز میں اشاروں اور علامتوں کے ذریعے واضح کرتی جاتی ہیں۔ ان کا مشہور افسانہ ''گائے'' اس کی بہترین مثال ہے۔ اس میں انھوں نے بڑی مہارت سے عورت کی جنسی گرہوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے، گائے کو علامت بنایا ہے۔ جس میں گائے کے فطری مطالبے کو اہمیت دی گئی ہے کہ وہ کس طرح اپنے حق کے لیے رسی تڑا کر انسانی معاشرے کے خلاف ایک انقلاب کی دعوت دیتی ہے اس افسانے میں فردوس حیدر کا لہجہ خاصا تلخ نظر آتا ہے اس میں وہ معاشرتی اقدار جو فطرت کے تقاضوں کے منافی ہیں انھیں جاندار طریقے سے بیان کرتی ہیں:

> مگر جوان بیاہی اور شوہروں سے بچھڑی اور فرقت کے غم سے نڈھال ہوجانے والیوں نے سوچا کہ گائے رسا تڑا کر گابھن ہونے جارہی ہے اور رشک کے ننھے منے جگنو ان کی آنکھوں میں چمکنے لگے اور انھوں نے جان لیا کہ یہ گائے کا حق

ہے۔ اگر وہ کھونٹے سے بندھی ڈکارتی رہتی ہے اس کا استحصال صرف اس وقت دم توڑتا ہے جب گائے میں رسا تڑانے کی قوت پیدا ہوجاتی ہے اور یہ قوت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب تخلیقی عمل کا جوالامکھی پھٹ نکلتا ہے۔(۷)

فردوس حیدر کے اسلوب میں حقیقت اور صداقت کی تلخی اور غور وفکر کی بھرپور صلاحیتوں کا اظہار تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی کئی جگہ الہامی اور وجدانی کیفیات کا بھی ادراک ملتا ہے۔مثلاً افسانہ ''گائے'' میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

بانسری کی لے تیز تر ہوئی۔ سوزوساز ایک ہوئے ناز اور نیاز باہم ملے زمین و آسمان سربسجود ہوگئے اور اسے یقین ہوگیا کہ وہ گھڑی آن پہنچی ہے جس کا اسے انتظار تھا اور جس کے انتظار میں اس کی ذات کرب کی بھٹی میں سلگتی رہی ہے۔تب اس نے سنہری پردے چاک کردیے اور آہنی زنجیریں توڑ دیں۔

دنیا والوں نے اس سے وہ گھڑی چھین لینا چاہی کہ وہ خوددرد کی اس کیفیت سے ناآشنا تھے۔ جو سرشاری اور قلندری کا سرچشمہ ہے۔ اذیت پسندوں نے اسے سنگسار کرنا چاہا مگر اب زنجیریں ٹوٹ چکی تھیں۔ وہ اپنی منزل کی طرف چلی نکلی تھی وہ چلتی رہی بھاگتی رہی اور اس کا تعاقب ہوتا رہا۔(۸)

پروفیسر سحر انصاری فردوس حیدر کے افسانوی مجموعہ ''راستے میں شام'' کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

راستے میں شام کے افسانے ایک ایسی خاتون کے قلم سے نکلے ہیں جو تعلیم یافتہ بھی ہے، دیانت دار اور بے باک بھی۔ یہ بے باکی کسی بے راہ روی کی حمایت میں نہیں بلکہ واقعات اور احساسات کو بے کم و کاست بیان کردینے سے تعلق رکھتی ہے۔ انکے افسانے ''جانور'' میں طوائف اور کال گرل کے حوالے سے عورت کے بارے میں جو تاثر ابھرتا ہے اس کے خدوخال گردوپیش کی زندگی کے حقائق ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔(۹)

فردوس حیدر ترقی پسند اور روشن خیال ذہن کی مالک ہیں وہ کسی ادبی تنظیم سے وابستہ نہیں ہیں۔ اپنی افسانہ نگاری کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

میرے لیے افسانہ لکھنا ''کتھارسس'' ہے کاغذ اور قلم میری رفاقت کرتے ہیں۔ ابتدا میں میں نے پنجابی شاعری کی لیکن مجھے تشفی نہیں ہوئی۔ میں تنہا بیٹھ کر طویل

گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ اپنے آپ سے پھر وہ گفتگو قاری تک پہنچی تو لگا کوئی اور بھی شریک ہے۔[۱۰]

علامتی افسانے کے تجربے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں:

علامتی افسانے محض ایک تجربہ نہیں تھا۔ اب بھی علامتی افسانے لکھے جا رہے ہیں اور اچھے بھی ہیں۔ البتہ بعض علامتی افسانوں میں ابلاغ نہیں تھا اس لیے گنجلک تھا یا محض فلسفہ بن کے رہ گیا تھا۔ ترقی پسند دور میں بہت اچھے افسانے بھی لکھے گئے اور کئی علامتی افسانے بھی بہت اچھے تھے۔[۱۱]

فردوس حیدر نے زندگی کی تلخیوں اور دکھوں کی اور اپنے عہد میں سامنے آنے والے مسائل کو اپنے خاص اسلوب میں پیش کیا ہے۔ خاص طور پر تیسری دنیا کے لوگوں کی داستان حیات اور اس سے پیدا شدہ ہزیمت کو اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے فرسودہ نظام اور فرقہ واریت پر احتجاج کیا ہے۔ یہ احتجاجی لہجہ براہ راست تو موجود نہیں ہے لیکن علامت اور اشارے کے ساتھ یہ کیفیت زیادہ شدت سے ظاہر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے فردوس حیدر کے افسانوی مجموعے ''راستے میں شام'' (۱۹۸۲ء) کے فلیپ پر فردوس حیدر کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

فردوس حیدر کے افسانوں میں کہانی پن ہے اور یہ بہت متنوع کیفیت ہے یہ محض پختہ پلاٹ کی بنت تک محدود نہیں۔ اسے تو نفس انسانی کے پیچ در پیچ تجربوں کے بیان کو بھی کہانی بنانا آتا ہے۔ فردوس نے زندگی کو دیکھا، اسے برتا اور اس طرح پیش کر دیا کہ زندگی کی صلیب پر جو سورج لٹکا ہوا نظر آ رہا ہے یہ وہ خود ہے۔ آج کی عورت کو سلیم احمد نے ملامتوں کے درمیان تلاش کیا ہے! مجھے وہ عورت فردوس حیدر کی کہانیوں میں کبھی متوازی، کبھی آڑی ترچھی، کبھی پیچ در پیچ راہوں پر چلتی ہوئی، اپنے آپ کو گم کرتی اور اپنے آپ کو پاتی ہوئی نظر آئی ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں تکنیک کا تنوع، دراصل تجربوں کا تنوع ہے۔ سچا فنکار سچے تجربے کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ سچی کوشش پیکر تراشی خود کر لیتی ہے۔

ساٹھ اور ستر کی دہائیوں کے جدید افسانوں کا مزاج ان کے یہاں اس طرح پیش نہیں ہوا ہے جیسا کہ دیگر جدیدیت پسندوں کے یہاں ہوا ہے مگر یہ ضرور ہے کہ جس معاشرے میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اسی کے ارد گرد کے حوالوں سے عصر کی کچھ جھلکیاں فردوس حیدر کے افسانوں میں ضرور مل جاتی ہیں اور پھر یہ کہ سماجی خارجیت کے موضوعات کو اپنانے کے باوجود فن اور اسلوب کے اعتبار سے جدیدیت کے رجحان سے وہ جڑی نظر آتی ہیں۔

فردوس حیدر آزادیٔ اظہار کی شدت سے قائل ہیں اور ہر طرح کے موضوع کو اپنے فطری لب و لہجہ میں پیش کرنے کی عادی ہیں وہ کسی مخصوص فکر یا دائرے تک محدود نہیں رہتیں بلکہ ان کا نقطہ نظر اور موضوعات میں وسعت اور تنوع موجود ہے اپنی اس خصوصیت کا وہ برملا اعتراف کرتی ہیں۔

> میں جس طرح زندگی میں فرد کی آزادی کی قائل ہوں اسی طرح ادب میں آزادیٔ اظہار کو پسند کرتی ہوں۔ کسی بندھے ٹکے منشور کے تحت لکھنے سے زندگی کے کئی پہلو، کئی زاویے تشنہ رہ جاتے ہیں۔ ذات سے معاشرے تک اور معاشرے سے ذات تک کا سفر اپنے تمام مشاہدوں، عذابوں اور تجربوں سمیت ہوتا ہے۔[۱۲]

ڈاکٹر وزیر آغا فردوس حیدر کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> فردوس حیدر عصری صورت حال کی بہت اچھی نباض ہیں اور یہ عصری صورت حال محض ملکی سرحدوں تک محدود نہیں بلکہ عالمی سطح کو بھی اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔[۱۳]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری فردوس حیدر کی افسانہ نگاری پر اپنی رائے دیتے ہیں کہ:

> جاگیردارانہ اور مشینی نظام کی آویزش سے معاشرہ جس قسم کی پیچیدگیوں سے گزرا ہے اور ذہن و فکر انسانی جس طرح جذب و جنوں سے دست و گریباں رہے ہیں گھریلو زندگی جس طرح منتشر ہوئی ہے اور قومیت کے نئے نئے تصورات نے جو گل کھلائے ہیں ان سب کا شعور فردوس حیدر کے یہاں ملتا ہے۔[۱۴]

بلاشبہ فردوس حیدر ہمارے عہد کی ایک اہم اور منفرد افسانہ نگار ہیں۔ فردوس حیدر نے اپنی کہانیوں کے ذریعے ہمارے معاشرے کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں خواتین کے مسائل کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے اور پھر پوری دیانتداری کے ساتھ اپنے احساسات کو خوبصورت افسانہ کی شکل دے کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ بقول رام لعل:

> فردوس حیدر کی کہانیاں تیسری دنیا کے سیاسی اور سماجی جبر کے خلاف احتجاج ہے۔[۱۵]

حواشی:

(۱) فردوس حیدر، ''خواب ہم کلامی''، ''پتھر میری تلاش میں''، ص ۲۷۳، ۱۹۹۲ء

(۲) ایضاً، ''کھنڈر کا نوحہ''، ''پتھر میری تلاش میں''، ص ۳۳۳، ۱۹۹۲ء

(۳) ایضاً، ''وجود کی بے آواز گلیاں''، ''پتھر میری تلاش میں''، ص ۳۵۶، ۱۹۹۲ء

(۴) ایضاً، ’’نیلے آنسو‘‘، ’’پتھر میری تلاش میں‘‘، ص ۴۸، ۴۷، ۳۴۷، ۱۹۹۲ء

(۵) ایضاً، ’’راستے میں شام‘‘، ص ۸۲، ۱۹۸۲ء

(۶) ایضاً، ’’دوسرا پتھر‘‘، ’’بارشوں کی آرزو‘‘، ص ۸، ۱۹۸۸ء

(۷) ایضاً، ’’گائے‘‘، ’’راستے میں شام‘‘، ص ۱۴۴، ۱۹۸۲ء

(۸) ایضاً، ص ۱۴۸

(۹) پروفیسر سحر انصاری، ’’فردوس حیدر کے افسانوں کا ایک مطالعہ‘‘، ماہنامہ ’’افکار‘‘، ص ۱۹، ۱۹۸۴ء

(۱۰) فردوس حیدر، غیر مطبوعہ خط بنام د ردانہ جاوید، ۱۳/ اکتوبر ۱۹۹۴ء، ’’پاکستان کی منتخب افسانہ نگار خواتین‘‘، (حیدرآباد: قصر الادب، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۲۶

(۱۱) ایضاً

(۱۲) ایضاً، ’’دوسرا پتھر‘‘، ’’بارش کی آرزو‘‘، ص ۸، ۱۹۸۸ء

(۱۳) ایضاً، ’’ڈاکٹر وزیر آغا، تا حال‘‘، ’’اب تک کے سارے افسانے‘‘، دی ریسرچ فورم، کراچی، ص ، ۲۰۰۷ء

(۱۴) ایضاً، ’’ڈاکٹر فرمان فتح پوری، راستے میں شام‘‘، ۱۹۸۲ء، ۲۰۰۷ء

(۱۵) ایضاً، ’’تا حال‘‘، ’’اب تک کے سارے افسانے‘‘، رام لعل (بھارت)، از فردوس حیدر، دی ریسرچ فورم، کراچی، ۲۰۰۷ء

مآخذ:

۱۔ انصاری، سحر، پروفیسر، ’’فردوس حیدر کے افسانوں کا ایک مطالعہ‘‘، ماہنامہ ’’افکار‘‘، ۱۹۸۴ء

۲۔ حیدر، فردوس، ’’خواب ہم کلامی‘‘، ’’پتھر میری تلاش میں‘‘، ۱۹۹۲ء

۳۔ ______، ’’کھنڈر کا نوحہ‘‘، ایضاً

۴۔ ______، ’’وجود کی بے آواز گلیاں‘‘، ایضاً

۵۔ ______، ’’نیلے آنسو‘‘، ایضاً

۶۔ ______، ’’راستے میں شام‘‘، ۱۹۸۲ء

۷۔ ______، ’’دوسرا پتھر‘‘، ’’بارشوں کی آرزو‘‘، ۱۹۸۸ء

۸۔ ______، ’’گائے‘‘، ’’راستے میں شام‘‘، ۱۹۸۲ء

۹۔ ______، غیر مطبوعہ خط بنام دردانہ جاوید، ۱۳/ اکتوبر ۱۹۹۴ء، ’’پاکستان کی منتخب افسانہ نگار خواتین‘‘، حیدرآباد: قصر الادب، ۲۰۰۲ء

۱۰۔ ______، ’’دوسرا پتھر‘‘، ’’بارش کی آرزو‘‘، ۱۹۸۸ء

۱۱۔ ______، ’’ڈاکٹر وزیر آغا، تا حال‘‘، ’’اب تک کے سارے افسانے‘‘، کراچی: دی ریسرچ فورم، ۲۰۰۷ء

۱۲۔ ______، ’’ڈاکٹر فرمان فتح پوری‘‘، ’’راستے میں شام‘‘، ۱۹۸۲ء، ۲۰۰۷ء